



## A Cultural Study of Akhtar Raza Saleemi's Novel *Lawakh*

### اختر رضا سلیمی کے ناول ”لواخ“ کا تہذیبی مطالعہ

Iffat Parveen<sup>1</sup>, Dr. Saima Iqbal<sup>2</sup>, Syeda Dur-e-Fatima Batool<sup>3</sup>

<sup>1</sup>Scholar, <sup>2</sup>Assistant Professor, <sup>3</sup>M. Phil Scholar, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad

Corresponding Email: [drsaimaiqbal@gcuf.edu.pk](mailto:drsaimaiqbal@gcuf.edu.pk)

pISSN: 3007-2077  
eISSN: 3007-2085

HEC approved in  
Y category.

Received: 20-06-2025  
Accepted: 08-08-2025  
Online: 12-08-2025



This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2025 by the author(s).

#### Abstract

Akhtar Raza Saleemi's novel "*Lawakh*" is not merely a historical narrative but a vivid cultural portrayal of the Murree, Galiyat, and Hazara mountain communities. The novel deeply embeds local language, customs, beliefs, spiritual practices, and resistance ethos in its storyline. Indigenous words, idioms, and modes of expression enrich its cultural flavor. The title "*Lawakh*" itself is a symbol of cultural identity. The fire signal lit atop mountain peaks, often used to indicate war, evacuation, or victory. In this novel, it serves not only as a practical tool but as a metaphor for collective consciousness and cultural alertness. The tribal structure, respect for elders, Sufi mysticism, reverence for saints, and rural systems of justice are presented with authenticity. For instance, the transformation of Sikandar's grandfather's shrine into a "Markaz-e-Tajalliyat" reflects the centrality of spiritual leadership in local culture. The novel also captures the sorrow of a culture disrupted by colonialism and internal betrayal. The forgotten Lawakh fire, once a communal rallying cry, becomes a symbol of a lost civilization and faded heroism. It mourns the erosion of values that once defined identity and unity. Thus, *Lawakh* serves as a literary elegy for a cultural heritage threatened by history's violent turns.

#### Keywords:

tribal hierarchy, Sufism, shrine culture, local dialects, folk tales, signal fires, colonialism

اختر رضا سلیمی کا تعلق ہزارہ کے مشہور قبیلے "کڑال" سے ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے نام کے ساتھ سردار

لگاتے ہیں۔ کڑالوں کے بارے میں مشہور انگریز تاریخ دان ڈینزل ایلن اپنی کتاب "پنجاب کی ذاتیں" میں لکھتے ہیں:

"کڑال کا خطہ تحصیل ایبٹ آباد میں ناٹا کے علاقہ پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے گھروں اور کھلیانوں سے جڑے ہوئے ہیں



اور بڑی سادگی اور جفاکشی کے ساتھ کاشت کاری کرتے ہیں۔“<sup>(۱)</sup>

اختر رضا سلیمی کے پردادا ”سردار فقیر محمد اپنے چا سردار نور خان“ کے ساتھ ۱۸۳۲ء کے قریب گلیات کے علاقے ٹولہ موجودہ ضلع ایبٹ آباد سے ہجرت کر کے کیکوٹ آگئے۔ اختر رضا سلیمی کا اصل نام سردار محمد پرویز اختر ہے۔ تمام سرکاری دستاویز میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۶ جون ۱۹۷۴ء درج ہے۔

اختر رضا سلیمی شاعر ہیں اور شاعری کے بارے میں اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں شاعری کے علاوہ کوئی اور کام ڈھنگ سے نہیں کر پایا۔ لیکن جب اختر رضا سلیمی نے ناول لکھے تو وہ کہتے ہیں کہ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ میں صرف ناول ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح لکھ پایا ہوں۔ وہ کہتے ہیں:

”میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ میں صرف ناول ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح لکھ پایا ہوں اور میرا کھٹارس جس

طرح ناول لکھتے ہوئے ہوا، شاعری کرتے ہوئے نہیں ہو سکا تھا۔“<sup>(۲)</sup>

اختر رضا سلیمی جہاں ایک طرف جدید شعری ادب کا معتبر حوالہ ہیں وہیں وہ نئی نسل کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے بیک وقت غزل، نظم اور ناول جیسی متنوع اصناف میں اپنا تخلیقی اظہار کیا اور تینوں میدانوں میں قابل ذکر کام کیا اور اردو ادب کو ثروت مند بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اختر رضا سلیمی نے اردو کے علاوہ ہند کو اور پوٹھوہاری میں بھی لکھا۔ ہند کو میں نثر جب کہ پوٹھوہاری میں شاعری کی۔ تاہم ان دونوں زبانوں میں ان کا ابھی تک کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔

اختر رضا سلیمی کی پہلی تحریر جو مئی ۱۹۹۱ء میں روزنامہ جنگ راولپنڈی کے بچوں کے صفحات میں چھپی، ان کے اصل نام کے ساتھ ہی چھی تھی۔ کچھ عرصہ اپنی تحریروں میں اختر رضا اور کیکوٹی بھی لکھتے رہے۔ مگر بعد میں انہوں نے اختر رضا کے ساتھ اپنے بڑے بھائی سردار محمد سلیم کے نام کی مناسبت سے سلیمی لگا لیا اور آج ادبی دنیا انہیں اختر رضا سلیمی کے نام سے ہی جانتی پہچانتی ہے۔

ان کا شعری مجموعہ ”اختراع“ اور ”ارتفاع“ کو یکجا کر کے ایک عنوان ”خوشبو میرے ساتھ چل پڑی“ کے نام سے رو میل پہلی لکیشنز راولپنڈی نے ۲۰۰۹ء میں چھاپا۔ خواب دان تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ ”جاگے ہیں خواب میں“ اختر رضا سلیمی کا یہ پہلا ناول ہے۔ جنرل دوسرا ناول اور ”لوان“ تیسرا ناول ہے۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق صحافت سے بھی ہے۔ اختر رضا سلیمی ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت ہیں، جنہوں نے غیر روایتی موضوعات کے ساتھ جمالیات اور تاریخی پس منظر کو اپنے ناولوں میں منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی تخلیقات نے ناقدین اور تعلیمی حلقوں سمیت اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

تہذیب عربی زبان کے لفظ ”ذ، ب“ سے مشتق ہے۔ تہذیب صدیوں سے انسانوں کی زندگی کا حصہ رہی ہے۔ تہذیب عربی



زبان کا لفظ ہے۔ جو اسم ہے اور مونث بھی ہے، اس کا تعلق باب تفصیل سے ہے۔ تہذیب کے اصل حروف وہ ذ، ہ، ب ہیں۔ تہذیب کو شناسکتگی اور خوش اخلاقی کے مفہوم میں بھی لیا جاتا ہے۔ تہذیب ایک ایسی سیڑھی ہے جس پر انسان نے پہلا قدم تب رکھا جب وہ غاروں کا باسی تھا۔ تب اس نے کچھ انفرادی اور اجتماعی اصول وضع کیے ہوں گے۔ یہی تہذیب کا نقطہ آغاز تھا۔ تہذیب کے لیے انگریزی اصطلاح "کلچر" بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کلچر اصل میں لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی کھیتی باڑی کرنا کے ہیں۔ سائنس مرڈن کے مطابق ثقافت کی توسیع شدہ صورت ہے۔

The broadest construction of culture identity is the civilization. <sup>(۳)</sup>

تہذیب ایک جادوئی لفظ ہے۔ جس کے معنوں میں وسعت بھی ہے اور معدومیت بھی۔ تہذیب کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم تو اہل قلم نے واضح کر دیئے ہیں۔ مگر بات جب کسی خاص تہذیب سے متعلق کی جائے تو اس کے بہت سے واقعات، ہمارے ذہن کے دریچوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ ہمارے دانشور پاکستانی تہذیب اور اس کے عناصر ترکیبی کی تشخیص میں مصروف ہیں۔ وہ جانا چاہتے ہیں کہ آیا پاکستانی تہذیب نام کی بھی کوئی شے ہے یا ہم نے فقط اپنی خواہش پر حقیقت کا مان کر لیا ہے اور اب ایک بے سود کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ سبب حسن کے مطابق:

”کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔“<sup>(۴)</sup>

تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جو ہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوس، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ۔ تہذیب کے مختلف مظاہرہ ہیں۔

اختر ضالیسی کے ناول "لوانخ" کا پس منظر ۱۸۵ کی جنگ آزادی ہے، جس میں مری، گلیات اور ہزارہ کے قبائل کی برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سکندر ہے جو ایک درویش کی صورت میں حضرت سید محمد خان کے مزار پر موجود ہے اور فلپیش بیک میں اپنی پوری کہانی سناتا ہے۔ اس کے والد خان زمانی خان، چچا فقیر خان اور آزاد خان مری چھاؤنی پر قبضے کی انقلابی کوشش میں شریک ہوتے ہیں، مگر ناظم خان کی مخبری سے سب منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ خان زمانی خان سمیت کئی افراد توپ سے اڑا دیے جاتے ہیں، کچھ گرفتار ہوتے ہیں، اور کچھ جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ سکندر کا بچپن بغاوت، جدائی اور خون ریزی کے سائے میں گزرتا ہے۔ وہ گیارہ سال غلام خان ترین کے ہاں پناہ لیتا ہے، اور پھر بدلے کی آگ میں، مخبر ناظم خان کو قتل کر دیتا ہے۔ مگر اس انتقام سے اسے سکون نہیں ملتا اور وہ برسوں تک در بدر پھر تارہتا ہے۔



سکندر کی زندگی کا اگلا حصہ خانقاہوں، درباروں اور مزاروں میں گزرتا ہے، جہاں وہ "مستانہ خان" کے نام سے درویشانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے دادا کا مزار اب ایک روحانی مرکز بن چکا ہے اور اسی مقام پر بیٹھا وہ راوی کی حیثیت سے ناول کی کہانی سناتا ہے۔ لواخ، جو کہ پہاڑ کی چوٹی پر جلا یا جانے والا الاؤ ہے، اس ناول کا نہ صرف عنوان ہے بلکہ ایک علامتی عنصر بھی ہے۔ یہ جنگ، مزاحمت، پیغام اور بغاوت کا استعارہ ہے۔ ناول میں لواخ کے تین مطلب دیے گئے ہیں: "حملہ ہو گیا ہے"، "بستی خالی کر دو"، اور "فتح ہو چکی ہے"۔ مگر جب سکندر آخری بار لواخ جلاتا ہے تو وہ بے معنی ہو چکا ہوتا ہے، کیونکہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور مقصد گم ہو چکا ہے۔ اس طرح "لواخ" ایک شکست خوردہ انقلاب، انفرادی انتقام اور تاریخ کی بے رحم گرداب میں گم ہوتی ہوئی پہچان کی علامت بن جاتا ہے۔ اس ناول میں ہم اب تہذیبی پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

فنون جو انسان کی جمالیات حسن کی تسکین کرتے ہیں۔ مثلاً تعمیرات، مجسمے، مصوری، رقص، خطاطی اور ادب وغیرہ شامل ہیں۔ خطاطی ایک فن تحریر ہے یہ فن دنیا کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ اور ہر زبان میں یہ فن خوشخطی کے لیے ہے۔ رومن، لاطینی، عربی زبان میں یہ فن خطاطی کافی مقبول ہے۔ اس ناول میں خطاطی نہ صرف ایک فن کے طور پر دکھائی گئی ہے بلکہ یہ کرداروں کی داخلی دنیا ان کی پہچان اور ان کے عہد کی تہذیبی اقدار کی نمائندگی بھی کرتی ہے:

”بڑی تقطیع کے ۲۱۲ صفحات پر مشتمل اس نوشتے کی لکھائی زیادہ خوبصورت نہیں تھی کہ میرے بابا خوش خط نہیں تھے لیکن اس کی چرمی جلد کے سرنامے کی خطاطی عمر گل صاحب نے کی تھی جو اپنے وقت کے مشہور خطاط تھے اور ان کی خطاطی کے چرچے ان دنوں چار دنگ عالم میں تھے۔“ (۵)

اس ناول میں خطاطی کو ایک مقدس اور روحانی عمل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اور خطاطی کو ایک ثقافتی ورثہ کے طور پر بھی دکھایا گیا ہے جو ماضی کی عظمت اور روایات کو زندہ رکھتا ہے۔ ناول میں خطاطی کو ایک تہذیبی پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو ماضی کی روایات اور اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔

تعمیرات اور تہذیب کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ تعمیرات (یعنی کہ مکان، عبادت گاہیں، راستے) دراصل کسی قوم یا تہذیب کی سوچ عقیدہ، فنی ذوق معاشرتی ڈھانچے اور طرز زندگی کی مادی شکل ہوتی ہے، اختر رضا سلیمی نے اس ناول میں جنگجو قبیلے کے ایک ڈیرے کا ذکر کیا ہے جو عام طور پر بستی والوں کے لیے جنگ کے دوران کھلتا تھا اس اقتباس میں دیکھیے:

”درجن بھر کمروں اور کشادہ صحن پر مشتمل اس ڈیرے کی سب سے عجیب بات اس کا زمین دوز ہونا تھا۔ اسے ایک بڑے گڑھے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یوں اس کے چاروں طرف قدرتی طور پر ایک چار دیواری تھی اور اس کی چھت



ارد گرد کی زمین سے ایک دو فٹ نیچے تھی یہی وجہ تھی کہ صرف سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی عمارت موجود ہے۔" (۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول "لوانخ" میں عمارتیں صرف اینٹ پتھر کی نہیں بلکہ جذبات، شناخت اور تہذیبی ورثے کی علامت ہیں۔

اگر ہم اپنی قدیم تہذیب کے اوراق الٹ کر دیکھیں، تو خالص دیسی غذا انسان کی پسندیدہ خوراک رہی ہے آج بھی گاؤں کے لوگ خالص مکھن کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ شہروں میں رہنے والے اس طرح کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔ اور ان کو جو چیز ملتی ہے اس میں ملاوٹ ہوتی ہے ناول میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں پر کھانے کا ذکر کیا گیا ہے اور ایسا ذکر کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گھروں میں کس طرح کے کھانے پکائے جاتے تھے:

"ایک دن پہلے مانگل سے سردیوں کی چھٹیاں گزارنے بستی آیا تھا۔ رات کے کھانے پر پورا خاندان جمع تھا۔ ماں نے میرے لیے خصوصی طور پر سرسوں کے ساگ کی کڑھی بنائی تھی۔ جو کسی اور کے کھیت سے چنوا کر لائی کہ ہمارے کھیتوں میں ابھی سرسوں نے پتے نہیں نکالتے تھے۔ سرسوں کے ساگ کی کڑھی مکھن اور مکئی کی روٹی کے ساتھ مجھے ہمیشہ مرغوب رہی ہے۔" (۷)

ہر معاشرے کی ایک الگ الگ تہذیب ہوتی ہے کیونکہ کھانے صرف جسمانی ضرورت نہیں بلکہ ہر تہذیب ثقافت اور اجتماعی شعور کا زمانہ حال ہوتے ہیں۔

لباس انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ دراصل لباس ایک ایسی چیز ہے جو تمدن کے ارتقا کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس طرح علاقے کی جغرافیائی خصوصیات اور بعض دوسری چیزیں بھی لباس کی وضاحت اور نوعیت پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ ساری دنیا کے لوگوں کا لباس یکساں ہو یہ بات سے انسان کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ لباس سے انسان کی تہذیب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ناول "لوانخ" میں ہمیں لباس سے متعلق تہذیب کا ذکر ملتا ہے کہ ان کے ہاں کس طرح کے لباس پہنے جاتے تھے:

"لیکن جو چیز حسن علی خان کو بابا سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کی پگڑی تھی۔ جو بابا میں قبیلے کے تمام افراد کی پگڑیوں سے مختلف تھی یہی ان کی سرداری کی نشانی تھی۔ ان کی پگڑی کا شملہ ہمیشہ اونچا ہوتا تھا اور اسے چاولوں کے پانی میں بھگوایا جاتا تھا تاکہ وہ اکڑی رہے۔ اور اس کا شملہ چلتی ہو میں بلند رہے۔" (۸)

لباس نہ صرف ضرورت ہے بلکہ یہ انسان کی تہذیب، ماحول اور ذاتی ذوق کا بھی عکاس ہوتا ہے۔

اسلام میں مہمان نوازی کو نہ صرف ایک معاشرتی روایت بلکہ ایک عبادت اخلاقی اور روحانی فریضہ ہے۔ مہمان نوازی کرنے



والے اور مہمان دونوں کے کچھ آداب ہوتے ہیں اور یہ آداب جو ہوتے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے روایتی ثقافتی اصولوں پر مبنی ہیں۔ اس ناول میں مہمان کے آداب کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کو ابھی بھوک ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ کھانا کھانا چھوڑ دیتا ہے:

”میں نے عجلت میں نوالہ توڑا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ میں بہت بھوکا ہوں اس لیے اس نے اپنے کھانے کی رفتار کم رکھی تاکہ میں زیادہ سے زیادہ کھا سکوں میں روٹی کا آخری نوالہ بھی ہڑپ کرنے والا تھا کہ یک دم مجھے خیال آیا کہ ایک آدھا نوالہ چھوڑ دینا چاہیے تاکہ مہمانی کے آداب پر حرف نہ آئے سو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔“<sup>(۹)</sup>

اختر رضا سلیمی نے ناول ”لواخ“ میں مہمان خانہ کا جو تصور دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہمان خانہ ایک روایتی جگہ ہے جو گھر کے مردوں کی مجلس مہمانوں کی استقبال اور فیصلوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب بغاوت یا آزادی کی بات ہوتی ہے تو یہی مہمان خانے ان مباحث کا مرکز بنتے ہیں۔ جب اس ناول کا ہیر واپسے بابا اور پچا کے ساتھ مل کر دوسری بستی میں جاتا ہے۔ تو وہاں کے مہمان خانے کو اپنے ڈیرے کا جو مہمان خانہ ہے اس سے تقابلی جائزہ کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ:

”ہمیں ایک مہمان خانے میں لے جایا گیا جس کا فرنیچر اور دیگر ساز و سامان بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ بستی میں سب سے بڑا مہمان خانہ ہمارا ہی تھا۔ جب اس کا موازنہ بستی کے مہمان خانوں سے کرتا تو مجھے فخر کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن یہاں کا مہمان خانہ دیکھ کر تو مجھے یوں لگا جیسے ہم ڈنگروں کے کسی باڑے میں رہ رہے ہیں۔“<sup>(۱۰)</sup>

مہمان خانہ صرف ایک کمرہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ثقافتی شناخت بھی ہوتا ہے۔ اور مہمان خانوں میں موجود ساز و سامان ہوتا ہے وہ تہذیب کا عکس دکھاتے ہیں۔

اختر رضا سلیمی کے ”ناول لواخ“ میں عورتوں کی عکاسی ایک گہرے تہذیبی نفسیاتی اور سیاسی پن سے منظر میں کی گئی ہے یہ عورتیں صرف ناول کی سجاوٹ یا ثانوی کردار نہیں بلکہ ناول کے مرکزی تھیمز ظلم جبر مزاحمت شناخت میں اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

”ان بے یقینی کہ سایوں میں کئی دن گزر گئے۔ خواتین میں طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے۔ اب انہیں اپنی عزیزوں کی موت سے زیادہ اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر دشمن کی فوج بستی میں داخل ہو گئی تو وہ ان کی عزت اور ان کے بچوں اور بزرگوں کے سامنے تار تار کر دے گے۔ کئی خواتین نے چاقو اور چھریاں تیز کر کے اپنے پاس رکھ لی تاکہ دشمن کے حملے کی صورت میں وہ اپنی عزت گنوانے سے پہلے اپنے سینے میں چھرا گھونپ سکیں۔ تمہاری دادی بھی ان میں شامل تھی۔“<sup>(۱۱)</sup>



اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ”لواخ“ کی عورت کمزور نہیں بلکہ بہت طاقتور پیچیدہ اور گہرے معنوں میں ایک مکمل وجود رکھتی ہے۔ اختر ضا سلیمی نے عورت کو صرف مظلوم دکھا کر ہمدردی حاصل نہیں کی بلکہ ایک مزاحمتی وجود کے طور پر پیش کیا ہے۔

”مشاغل“ سے مراد وہ سرگرمیاں یا کام ہیں جو انسان فارغ وقت میں شوق یا دلچسپی کے طور پر کرتا ہے۔ یہ وہ کام ہوتے ہیں جو دل کو خوشی دیتے ہیں اور ذہنی سکون فراہم کرتے ہیں۔ کھیل کا تہذیب سے تعلق نہایت گہرا ہے۔ کھیل محض جسمانی مشغلہ یا تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ یہ کسی بھی معاشرے کی ثقافت، اقدار، شناخت اور اجتماع کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ناول میں گنگے کے ذکر کی واضح مثال ہے بلکہ اس کے ذریعے ناول نگار نے وہاں کے لوگوں کی تہذیب اور ثقافت کو اجاگر کیا ہے:

”گنگے کا فن جسے دوسرے مسلمانوں کا ناچ کہتے تھے۔ ہمارے قبیلے کا ایک محبوب ناز تھا جوں ہی ہماری عمر پانچ سال ہوتی تھیں ہم پر دو پابندیاں ضرور عائد کی جاتی تھی ایک مسجد میں قرآنی قاعدہ پڑھنے کی اور دوسرا عصر کے وقت گنگے کھیلنے کی جس کے لیے لکڑی کی تلواریں اور ڈھالیں ترکھان سے خصوصی طور پر تیار کروائی جاتی تھی۔“ (۱۲)

پہلا کھیل جو گنگا ہے۔ ایک روایتی مارشل آرٹ ہے۔ اس میں ۲۴ دھات کی تلواروں کے ساتھ رقص کی طرز پر جنگی حرکات کی جاتی ہیں۔ یہ ایک طرح کا رقص اور جنگ کا انتظار ہے دوسرا کھیل جو ہے وہ کبڈی کا ہے۔ کبڈی بطور دیہی ثقافت کا حصہ ہے۔ کبڈی ایک علاقائی کھیل ہے جو جسمانی قوت مہارت اور دلیری سے جڑا ہوا ہے ناول میں اس کا ذکر گاؤں کی زندگی کے تناظر میں آیا ہے۔ جو تہذیبی یاداشت کا حصہ ہے۔

ناول ”لواخ“ میں سپاہ گری ان کا پیشہ تھا۔ اور یہ ان کا صرف پیشہ ہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنا وقار سمجھتے تھے ”لواخ“ میں سپہ گری ایک ثقافتی پیشہ ہے۔ ناول کے مرکزی کردار سکندر اور اس کے آبا و اجداد سپاہی تھے۔ یعنی دشمنوں (سکھوں کے بعد انگریزوں) کے خلاف لڑنا ان کے خون میں شامل تھا سکندر خان بتاتا ہے کہ:

”جس طرح اس نوشتے کے جلد ساز کا آبائی پیشہ گفٹ سازی تھا اور کبھی کبھی جب اسے جو توں سے فرصت ملتی تو کتابوں کی جلد بھی کر لیا کرتا بالکل اس طرح ہمارا پیشہ تو سپاہ گری تھا۔“ (۱۳)

اختر ضا سلیمی نے اپنے ناول میں سپاہ گری (جنگی خدمات اور فوجی مہارت) کے موضوع کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے اس کے علاوہ اس ناول میں صرف اختر ضا لڑائی کے پیشے نہیں کرتے بلکہ سپہ گری کی اخلاقی پہلوؤں جیسے غیرت قبیلے کی وفاداری مٹی کی محبت اور کون سے اصولوں پر جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔

اگر ہم اپنی قدیم تہذیب پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شکار کھیلنا مسلمانوں کے مشاغل میں تھا۔ اس سے بھی مسلمان



ہی ہندوستان میں لائے مذہب سے لے کر زندگی کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں نے ہندوستان کے رہن سہن، عقیدے قرآن اور طرز معاشرت کو بہت متاثر کیا۔ اختر رضا سلیمی کے ناول میں نہ صرف ایک تاریخی داستان ہے بلکہ اس میں شکار کا منظر اور ثقافتی پہلو بھی اہمیت رکھتے ہیں:

”انہیں اگر کسی چیز کا خوف تھا تو صرف شیروں، چیتوں اور دوسرے درندوں کا تھا۔ اس دور میں بہادری کا تصور بھی انہی جانوروں کے شکار سے وابستہ تھا۔ سب سے بہادر شخص وہی کہلاتا تھا۔ جو کسی درندے کا شکار کرے وہ اپنے شکار کردہ درندوں کی کھالوں میں گھس بھر کر گھروں میں سزا دیتے تھے تاکہ دوسروں پر اپنی بہادری کا روب جما سکیں۔“ (۱۴)

ناول میں شکار کا ذکر اس خطے کی روایات اور ثقافت کا حصہ ہے۔ بلکہ یہ مقامی لوگوں کی بہادری اور مہارت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔

ہماری تہذیب خصوصاً برصغیر کی مسلم اشرافیہ اور مغل راجپوت جاگیردار اور نواب کلچر میں گھوڑے پالنا نہ صرف ایک شوق تھا۔ بلکہ شان و قار جنگی طاقت اور ثقافتی عظمت کی علامت بھی تھا اس ناول میں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف گھوڑوں کے کھیل اور گھڑ سواری کو اپنی شان مانتے تھے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

”چونکہ وہ ایک بڑے خاندان کے فرد تھے۔ سوان کے ہاں گھوڑے پالنے کا شوق تھا۔ ان کے اصطل میں ہر نسل کا گھوڑا موجود تھا۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں گھڑ دوڑ وغیرہ کاروبار نہیں تھا۔“ (۱۵)

دیہی علاقوں میں چوہدری زمیندار یا وڈیرے کا گھوڑے پر سوار ہونا اس کی شناخت کا حصہ ہوتا تھا۔ گھوڑے پر سواری گویا ایک چلتا پھرتا اعلان ہوتا تھا کہ یہ شخص معاشرتی طور پر برتر ہے۔ اس ناول میں مرغ پالنے کے شوق کو وہ کم تر سمجھتے تھے یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ امیر زادوں زمینداروں نے مشغلے اپنائے جنہیں اعلیٰ اور وقار والے مشغلے سمجھا جاتا تھا۔

رسومات سے مراد روایتی معاشرہ یا مذہبی طریقے اور عمل ہے کہ کسی قوم معاشرے یا خاندان میں نسل در نسل چلے آرہے ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر خاص موقع پر ادا کیے جاتے ہیں جیسے کہ شادی، پیدائش، موت، طواف یا مذہبی عبادت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ پیدائش ایک اہم قدرتی اور سماجی واقعہ ہے جس سے مراد کسی انسان کا اس دنیا میں آنا کے وطن سے جنم لینا پیدائش نہ صرف ایک حیاتیاتی عمل ہے۔ بلکہ مختلف مذاہب قوموں اور ثقافتوں میں اس سے متعلق رسومات اور روایات بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

بچے کی پیدائش پر کان میں اذان دینا ایک ایسا عمل ہے جو تہذیب، مذہب اور روحانی شعور کے امتزاج کی علامت ہے۔ اس کا



تعلق صرف مذہبی عقیدے سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی عمل کے طور پر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس ناول میں اس کا ذکر دیکھئے:

”مجھے بتایا گیا تھا کہ بیساکھ کی رات میری پیدائش ہوئی تھی تو حسن علی خان نے بابا سے کہا کہ مجھے ساتھ لے کر جاؤ

تمہارے بیٹے کے کانوں میں اذان میں خود دوں گا جس پر میرے بابا خوشی سے پھولے نہیں سائے تھے۔“<sup>(۱۶)</sup>

یہ رسم مسلمانوں کی تہذیب کا ایک مشترکہ ورثہ ہے۔ اس عمل سے ایک اجتماعی تہذیبی وحدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اختر رضا

سیلیبی کے ناول ”لوانخ“ میں سر کے پیدائشی بال (جھنڈ) اتارنے کی رسم کا ذکر ایک اہم ثقافتی اور تہذیبی پہلو کے طور پر آتا ہے جو بچوں کی

پیدائش کے بعد کی روایات اور سماجی رسم و رواج کو ظاہر کرتا ہے:

”میری جھنڈ اتارنے کی رسم والے دن وہ اپنے گاؤں سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خصوصی طور پر آئے تھے۔ اور

اپنے ساتھ ایک بکرا بھی لائے تھے جسے جھنڈ اتارنے کی رسم کے فوراً بعد ذبح کیا تھا۔ اور بستی والوں کی ضیافت کی

گئی تھی۔“<sup>(۱۷)</sup>

اس ناول میں جھنڈ اتارنے کے موقع پر عموماً خاندان رشتہ دار اور قریبی دوست جمع ہوتے ہیں۔ جو اس رسم کو سماجی تقریب کی

شکل دیتے ہیں۔ یہ رسم نہ صرف فرد کی ذاتی زندگی کا حصہ ہے بلکہ سماجی اور تہذیبی تعلقات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

شادی کا مطلب ہے عورت اور مرد کو باہمی ازدواجی رشتے میں منسلک کر دینا لیکن ان دونوں کی باہمی رضامندی ضروری ہے

ہماری تہذیب میں شادی کو ایک رکن تصور کیا جاتا ہے۔ ناول میں اس طرح بات ہوئی ہے کہ کہ جب چھوٹے چچا کو اپنی دوسری بستی کی

لڑکی سے عشق ہو گیا پہلے دادا نہیں مان رہے تھے وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ رشتہ نہیں ہو گا لیکن جب مان جاتے ہیں۔ تو لڑکی کے گھر والے رشتہ

نہیں دیتے اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیں:

”فقیر چچا کو اپنی نوجوانی میں کسی دوسری بستی کی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ پہلے تو ہمارے دادا نہیں مانے۔۔۔ وہ دل

پر پتھر رکھ کر رشتہ مانگنے اس لڑکی کے خاندان میں گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہمارے ہاں کسی

دوسری برادری میں رشتوں کا لین دین برا سمجھا جاتا ہے۔“<sup>(۱۸)</sup>

اس کے علاوہ وہاں پر ایک اور رسم تھی اگر دولہا اس کو پورا کر لیتا تو شادی ہو جاتی تھی۔ ورنہ بارات واپس چلی جاتی تھی:

”سال بھر بعد جب ان کی بارات ڈولی لینے پہنچی تو دستور کے مطابق دولہا کو نشانہ لگا کر ٹمن گرا تا تھا۔ ٹمن زیادہ

بلندی پر بھی نہیں باندھا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود تینوں بار ان کا نشانہ خطا گیا جس کی وجہ سے بارات کو ڈولی کے

بغیر پلٹنا پڑا۔“<sup>(۱۹)</sup>

ناول ”لوانخ“ میں جو ’ٹمن‘ کی رسم ہے ماحول میں رچی بسی ایک مقامی ثقافتی روایت ہے۔ جس کا محور ٹمن مری یا پہاڑی علاقوں



میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر لگائی جاتی ہے۔

برادری سے باہر شادی کرنا بر صغیر کے بیشتر علاقوں میں ہمیشہ سے ایک حساس اور معاشرتی طور پر پابندی والا موضوع رہا ہے۔ برادری سے باہر شادی کو "غیرت" اور "روایت" کے خلاف سمجھا جاتا تھا اکثر ایسی شادیوں کو "خاندان کا منہ کالا کرنا" تصور کیا جاتا بعض قبائل میں تو یہ بھی رواج تھا۔ کہ اگر کوئی فرد برادری سے باہر شادی کر لیتا تو اس کو برادری سے نکال دیا جاتا تھا۔ نہ کوئی تعلق باقی رہتا اور نہ ہی وراثت میں اس میں حصہ ملتا تھا اس ناول میں ہمیں دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کس طرح سے برادری سے باہر شادی کرنے کو معیوب جانتے تھے:

”ورنہ دوسرے قبائل میں آج تک اس کا رواج نہیں خاندان اور برادری سے باہر رشتہ دینا ہمارے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ نہ صرف نائی نائیوں میں اور موچی صرف موچیوں میں رشتوں کا لین دین کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی کسی دوسری برادری میں شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔“<sup>(۲۰)</sup>

اگر اسلام میں دیکھا جائے تو اسلام نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی کہ شادی صرف برادری یا قبیلے میں ہو اسلام نے معیار صرف بتایا ہے۔ کہ دین دار ہو اخلاق اچھے ہوں۔

انسان جیسے جیسے ترقی کرتا ہوا ٹیکنالوجی کی طرف سفر کرتا ہے تو اپنی گزشتہ تہذیبوں کو بس تصویری صورت میں محفوظ کر لیتا ہے جیسے گزرے وقتوں میں مواصلاتی نظام خط و کتابت کا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی جگہ موبائل فون اور انٹرنیٹ نے لے لی۔ اگر دیکھا جائے تو کسی تہذیب کے معدوم ہو جانے سے سب سے زیادہ متاثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پیشہ ورانہ اس تہذیب سے منسلک ہوتے ہیں اور ان کے لیے نئی تہذیب ان کی موت کے برعکس ہوتی ہے۔ ناول میں جنرل کا ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کا یہ بھی پیشہ تھا:

”میں نے پہلے ہی رات جنرل کے سارے معاملات سمجھ لیے آٹے کو باریک پیسنے کے لیے پاٹوں کے ساتھ لگی لکڑی کی کیل کو کیسے گرانا ہے۔ اگر موٹا دلنا ہے تو اوپر والا پارٹ نچلے پارٹ سے مزید اوپر کیسے اٹھانا ہے۔ ایک من گندم پیسنے میں کتنا وقت لگتا ہے اور اتنی ہی مکئی پیسنے ہوئے کتنا وقت زائد درکار ہوتا ہے۔“<sup>(۲۱)</sup>

یہ اقتباس بظاہر تو ایک فنی ہنر کی تربیت کا ذکر ہے۔ لیکن اس کے تہ میں وراثت، شناخت اور روایت کی تہذیب چھپی ہوئی ہے اس کے علاوہ ناول ”لواخ“ میں جنرل کوئی ایک خاص کردار کا نمائندہ ہے جو نہ صرف جنرل چلانے کا ہنر رکھتا ہے۔ بلکہ مہمان نوازی خدمت اور روحانی صنف کی تخلیق میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

عشق و محبت کی کہانیاں صدیوں سے انسانی دلوں کو چھوتی آئی ہیں اور یہ انسانی تہذیب کا ایک حصہ رہی ہیں۔۔۔ یہاں محبت میں



فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی دودل ایک خیال میں ڈھل جاتے ہیں۔ خاموشی میں بھی گفتگو ہوتی ہے۔ اس ناول میں بھی ہمیں اس طرح کی عبارت ملتی ہے۔ جو ایک مختصر مگر گہری محبت کی سچی کہانی پیش کر رہی ہے جو سادگی اور خلوص پر مبنی ہے:

”میں نے جب اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو میرے ذہن میں اپنے خدو خال ابھرنے کی بجائے حاجرہ بی بی کی گردن، ہونٹ، کان، ناک اور چوڑی سی پیشانی ابھری اور مجھے بے حد سکون ملنے لگا۔“ ار تکاز ہوا ”کچھ ہی دیر میں باباجی کی آواز سنائی دی:

”کی ہو رہا ہے“ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا میں ہاجرہ بی بی کے خدو خال میں پوری طرح منہمک تھا۔“ (۲۲)

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو خود سے نکال کر کسی اور میں ڈھال دیتا ہے۔

دوستی ایک اچھا اور سچا جذبہ ہے جس کو اگر انسان چاہے تو ساری زندگی برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو اسی وقت بھول سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی دوستی اس قدر باوقار اور تواضع سے بھرپور ہوتی ہے۔ ایک لمحہ ہمارے لیے پر سکون راحت سبب بن سکتا ہے۔ ناول ”لواخ“ میں ہمیں مصنف نے دوستی کی عظمت کو بڑے دل فریب انداز میں بیان کیا ہے:

”اس واقعے کے تقریباً ۱۱ سال بعد میں اپنا سب کچھ لٹا کر اسی شاندار حویلی میں بیٹھا تھا کہ غلام خان ترین نے؛ جنہوں نے اس مشکل وقت میں مجھے ہر طرح سے سنبھالا دیا اور میرا اتنا خیال رکھا تھا کہ شاید کوئی گنا بھی نہ رکھ سکتا۔“ (۲۳)

دوستی ایسا جذبہ ہے جو ہم ساری زندگی برقرار رکھ سکتے ہیں اور اس رشتے کے ساتھ انسان اپنا دکھ سکھ سب بتا سکتا ہے۔ انسان کا اپنا حلقہ احباب ایسا بنانا چاہیے۔ جو اس کو سمجھ سکے دوست کے منہ سے نکلنے والی ہر بات اس قدر شائستہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان اس کے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

روایتی ہتھیاروں سے مراد وہ ہتھیار ہوتے ہیں۔ جو کانی پرانے دور سے چلے آ رہے ہوں۔ مگر موجودہ دور میں جس طرح کے ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ ان سے مختلف ہوتے ہیں جدید نہیں اگر ان کو تہذیبی حوالے سے دیکھا جائے تو ہماری تعظیم میں شامل تھے۔ اور جنگجوؤں کے پاس تھے اور روایتی ہوتے تھے۔ ناول میں اس طرز کے ہتھیاروں کا ذکر ملتا ہے:

”ناشتے کے بعد وہ اپنے کچھ جنگجو ساتھیوں کے ساتھ باہر آئے اور ان کے ساتھ مل کر ان ہتھیاروں کا جائزہ لیا جنہیں مقامی لوہاروں نے انہی دنوں میں تیار کیا تھا۔ ان میں زیادہ تر تلواریں چاکو اور چھریاں تھیں۔“ (۲۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح کے ہتھیار ان کی تہذیب کا حصہ رہے ہیں۔ اور اب کے دور کے آلات کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر پرانے اور موجودہ دور میں استعمال ہونے والے ہتھیار کس قدر جدید ہیں۔ اور ہتھیاروں کا استعمال انسانی



تہذیب کی تاریخ میں ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

جانور پالنا ہماری تہذیب میں شامل ہے۔ اور لوگوں کا شوق بھی ہے کچھ لوگ اپنے شوق کے طور پر جانور پالتے ہیں۔ ناول ”لواخ“ میں بھی ہمیں اس طرح کے روایتی اور تہذیبی جانوروں کا ذکر ملتا ہے جنہیں لوگ شوق سے پالتے تھے۔ جیسے سکندر خان بتاتا ہے کہ ہمارے ہاں اب بھی کوئی گھوڑا، گدھا، خچر یا ٹٹو، اگر سواری یا برداری کے قابل نہ رہے تو اسے مار دیا جاتا ہے۔ یا پھر اس کو جنگل میں چھوڑ دیا جاتا ہے یا تو اسے جنگلی درندے ہڑپ کر لیتے ہیں یا پھر سردی اور بھوک کی وجہ سے خود ہی مر جاتے ہیں بابا کو بھی لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس کو ذبح کر کے دفنایا جائے۔ لیکن انہوں نے کہا تھا کہ اس نے میری بہت خدمت کی ہے جب تک طبی موت نہیں مرتا اب اس کی خدمت کروں گا:

”جس گھوڑے کا چمڑا اس نوشتے پر منڈھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے کا نام لالی تھا؛ یہی وہ گھوڑا تھا جس پر بیٹھ کر بابا نے حسن علی خان کی سرکردگی میں سکھوں کے خلاف وہ آخری جنگ لڑی تھی۔“<sup>(۲۵)</sup>

اس عبارت سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح جانوروں کے ساتھ ان کے مالک مانوس ہوتے ہیں یعنی اگر انسان کا جانور مر جاتا ہے۔ تو وہ کس قدر غم زدہ ہوتے ہیں جس طرح انسانوں کے ساتھ لوگوں کی وابستگی ہوتی۔

گھوڑے کی کھال کے جوتے بنانے کی روایت ایک قدیم اور مخصوص ثقافتی علاقائی اور قوالی روایت رہی ہے۔ ناول ”لواخ“ میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی کھال سے جوتے بنانے کی روایت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ گھوڑوں کی کھال سے جوتے خیمے اور لباس تیار کرتے تھے گھوڑے کی کھال کو سک اور دیر پا سمجھا جاتا تھا اسی لیے ان علاقوں میں اسے استعمال کرنے کی روایت تھی پختون اور دیگر قوالی معاشروں میں گھوڑے کی کھال سے بنے جوتے بعض اوقات روایتی جنگی لباس یا خاص مواقع کے لیے استعمال ہوتے تھے ایسے جوتے زیادہ ترویر پا اور مضبوط سمجھے جاتے تھے اور پہاڑی علاقوں کے لیے موضوع تھے:

”ہمارے ہاں جس گھوڑے نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو اس کی کھال اتاری جاتی ہے اور اس کی کھال کا جوتا پہننا

صرف اور صرف اس شخص کا حق ہوتا ہے۔ جو جنگجو عام سواری اور بار برداری کے گھوڑے اور خچروں کو جب وہ

سواریا بار برداری کے قابل نہ رہیں مار کر کھال سمیت دفن کر دیا جاتا ہے۔“<sup>(۲۶)</sup>

اس ناول میں گھوڑے کی کھال سے جوتے بنانے کا عمل ایک ثقافتی اور مشرقی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جو کہ مخصوص قبائلی یا دیسی

معاشروں کی دستکاری اور روایات کو اجاگر کرتا ہے۔

پہلے زمانے میں اکثر لوگ کئی اہم کام کرنے سے پہلے نجومیوں یا ستارہ شناسوں سے ضرور مشورہ لیتے تھے۔ یہ روایت صرف



برصغیر تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے کئی حصوں میں عام تھی اور نجومی سے پوچھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کون سا دن وقت یا گھڑی نیک ہے۔ اس ناول میں بھی دکھایا گیا ہے، کہ امر سنگھ جو ہے وہ نجومی سے پوچھتا ہے کہ کون سی گھڑی نیک ہے کہ ہم حملہ کریں اور کامیاب ہوں گے: ”جب سرائے صالح میں بیٹھ کر ہم اس حملے کے بارے میں اصلاح مشورہ کر رہے تھے امر سنگھ نے میری موجودگی میں کرشن داس کو طلب کیا جو اس دور کا ایک ماہر نجوم تھا امر سنگھ نے اسے حکم دیا کہ وہ اس جنگ کا زانچہ تیار کرے اور حملے کی شب گھڑی کا تعین کرے دوسرے روز اس نے امر سنگھ کو بتایا کہ آپ جب چاہیں بے دھڑک حملہ کر دیں آپ کو کچھ نہیں۔“ (۲۷)

ہمارے مشرقی اور ثقافتی روایات میں بزرگوں کے مزاروں کی زیارت اور ان کے ساتھ وابستہ رسوم و رواج ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ روایات نہ صرف مذہبی حقائق کی عکاسی کرتی ہیں۔ بلکہ ہماری تاریخ و روحانیت اور اجتماعی شناخت کا بھی حصہ ہیں۔ جیسے کہ اس ناول کا مرکزی کردار ”سید سکندر خان زمانی“ بتاتا ہے، کہ جس مزار پر اس نے پناہ لی ہے۔ وہاں کے لوگ نظروں اور چڑھاوے چڑھانے آتے ہیں۔ منٹیں مانتے ہیں۔ وہاں پر وہ لنگر تقسیم کرنے کے علاوہ اس دربار پر موجود پرندوں وغیرہ کے لیے بھی کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

”یہاں کا لنگر ایسے ہی زائرین کی عقیدت کی بدولت ۱۲ مہینے جاری و ساری رہتا ہے یہاں تک کہ بعض لوگ یہاں کے بندروں، کتوں، بلیوں، مرغوں اور موروں وغیرہ کے لیے بھی کھانے کی اشیاء ساتھ لے کر آتے ہیں۔“ (۲۸)

اختر رضا سلیمی کا یہ ناول محض ایک تاریخی افسانہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی فکری اور علامتی بیانیہ ہے۔ جو اردو فکشن میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ناول نہ صرف ہزارہ کے علاقے کی شناخت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مرکزی کردار اپنے آباؤ اجداد کی کہانی کو ”نوشہ“ یعنی دستاویز کی صورت میں محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ موروثی روایت ”لوانخ“ کے ذریعے مضبوط ہوتی ہے سلیمی نے ہزارہ کی ثقافت، پہاڑی دیہات عورتوں کے جذبے اور مقامی معاشرت کو انتہائی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول ”لوانخ“ باقی سب ناولوں سے ہٹ کر ہے۔ امید ہے یہ ناول کئی صدیوں تک اردو ادب پر اپنی چھاپ بٹھانے رکھے گا۔ اور اردو ادب میں آب حیات کی مانند رہے گا۔

### حوالہ جات

- ۱۔ سر ڈینزل ایلسن، پنجاب کی ذاتیں، مترجم: یاسر جواد، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص: ۱۷۰
- ۲۔ اختر رضا سلیمی، جنڈر (فلیپ)، راولپنڈی: ریمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء



3. John H Mars-The Buddhist art of Gandharn; The story of early School; it's birth growth/Decline Cambridge University Press 1940

- ۴- سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: مکتبہ دانیال، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء، ص: ۱۴
- ۵- اختر رضا سلیمی، لوآنخ، راولپنڈی: ریمیل ہاؤس پبلیکیشنز، ۲۰۲۳ء، ص: ۴۷
- ۶- ایضاً، ص: ۱۳۲
- ۷- ایضاً، ص: ۹۲
- ۸- ایضاً، ص: ۳۷
- ۹- ایضاً، ص: ۳۲
- ۱۰- ایضاً، ص: ۷۰
- ۱۱- ایضاً، ص: ۷۱
- ۱۲- ایضاً، ص: ۷۸
- ۱۳- ایضاً، ص: ۳۷
- ۱۴- ایضاً، ص: ۸۲
- ۱۵- ایضاً، ص: ۱۱۹
- ۱۶- ایضاً، ص: ۱۵۵
- ۱۷- ایضاً، ص: ۳۷
- ۱۸- ایضاً، ص: ۵۷
- ۱۹- ایضاً، ص: ۴۲
- ۲۰- ایضاً، ص: ۱۴۹
- ۲۱- ایضاً، ص: ۱۵۰
- ۲۲- ایضاً، ص: ۱۶۹
- ۲۳- ایضاً، ص: ۱۶۹
- ۲۴- ایضاً، ص: ۴۶



الضياء، ص: ٦٣	٢٥-
الضياء، ص: ٦٣	٢٦-
الضياء، ص: ٦٥	٢٧-
الضياء، ص: ٢٦	٢٨-

## References

1. Ibsen, D. S. (2011). *Panjāb kī zāten* (Y. Jawād, Trans.). Lāhaur: Fiction House, p. 17.
2. Salīmī, A. R. (2017). *Jandar (Flip)*. Rāwalpindī: Ramīl House of Publications.
3. Mars, J. H. (1940). *The Buddhist art of Gandhāra: The story of early school; its birth, growth, decline*. Cambridge: Cambridge University Press.
4. Ḥasan, S. (1977). *Pākistān meñ tahzīb kā irtiqā'*. Karāchī: Maktabah Dāniyāl, p. 14.
5. Salīmī, A. R. (2023). *Luwākh*. Rāwalpindī: Ramīl House Publications, p. 47.
6. Ibid., p. 132.
7. Ibid., p. 92.
8. Ibid., p. 37.
9. Ibid., p. 32.
10. Ibid., p. 70.
11. Ibid., p. 71.
12. Ibid., p. 78.
13. Ibid., p. 37.
14. Ibid., p. 82.
15. Ibid., p. 119.
16. Ibid., p. 155.
17. Ibid., p. 37.
18. Ibid., p. 57.



19. Ibid., p. 42.
20. Ibid., p. 149.
21. Ibid., p. 150.
22. Ibid., p. 169.
23. Ibid., p. 169.
24. Ibid., p. 46.
25. Ibid., p. 64.
26. Ibid., p. 64.
27. Ibid., p. 65.
28. Ibid., p. 26.